بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

خرّم مراد

پانچ سال میں تیسری دفعہ ملک پر مسلط کردہ انتخابات بھی ایک بار پھر' چہروں کی تبدیلی کے علاوہ' کوئی نتیجہ نکالے بغیر اپنے اختتام کو پہنچ گئے۔ نہ پے در پے پیدا ہونے والے بحرانوں کے اسباب کا کچھ ازالہ ہوا' نہ ملک کو درپیش سنگین خطرات اور مسائل کے حل کی کوئی راہ نکلی' نہ سیاسی استحکام کا سامان ہوا' اور سب سے بڑھ کر یہ کہ' نہ ملک کے غریب اور مظلوم عوام کا مقدر جاگنے کی کوئی سبیل پیدا ہوئی۔

اب بھی یہ عوام اسی طرح ظلم کی چکی میں پستے رہیں گے' اور ان کو دین و ایمان اور اخلاق کی دولت سے محروم رکھا جاتا رہے گا۔ چوپالوں' تھانوں' دفتروں اور کارخانوں میں انہیں اسی طرح ذلیل کیا جاتا رہے گا' ان کی بہنوں اور بیٹیوں کی عصمتیں اسی طرح "بڑوں" کی جاگیر بنی رہیں گی اور انہیں بازاروں اور تھانوں میں اسی طرح ننگا کیا جاتا رہے گا۔ اب بھی ان کو دو وقت اپنا پیٹ بھرنا اسی طرح دوبھر رہے گا' اور گرانی کا روز بروز بڑھتا بوجھ ان کی کمر توڑتا رہے گا۔ ان کے بچے اب بھی اسی طرح تعلیم سے محروم رہیں گے' اور جو تعلیم پالیں گے وہ کاغذ کے ٹکڑے ہاتھوں میں لیے روزگار کے لیے اسی طرح دربدر کی ٹھوکریں کھاتے پھریں گے۔ دفتروں اور عدالتوں میں ان کے فیصلے اب بھی غیر ملکی آقاؤں کی اسی زبان میں ہوتے رہیں گے جسے سمجھنے سے وہ قاصر ہیں۔ انصاف اب بھی ان کی دسترس سے باہر رہے گا' اور قانون اب بھی ظالم کی پشت پناہی کرتا رہے گا۔ کسان اب بھی اسی طرح اپنی محنت کے صلہ سے محروم رہیں گے' ان کے دیہاتوں میں اسی طرح اندھیرا رہے گا' انہیں پینے کے لیے خالص پانی اب بھی نہیں ملے گا' ان کے مریض اسی طرح دواؤں کے لیے ترستے رہیں گے اور ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرتے رہیں گے' ان کی بیل گاڑیاں اور ٹریکٹر اسی طرح ٹوٹی پھوٹی مٹی کی سڑکوں پر دھول کھاتے چلتے رہیں گے

جبکہ دوسری طرف اسلام آباد - لاہور موٹروے جیسی صاف شفاف اور چمکتی دمکتی سڑکیں بنتی رہیں گی' ان کے بچے اب بھی انہی بے چھت کے پرائمری سکولوں میں پڑھتے رہیں گے جہاں نہ فرنیچر ہوتا ہے نہ استاد۔

ادھر قومی کشتی کے ناخدا اب بھی پہلے کی طرح کشکول گدائی بھر بھر کے آنے والی نسلوں کا بال بال قرضوں کے جال میں جکڑتے رہیں گے' یہاں تک کہ آج حکومت کی ۳۶ فیصد آمدنی قرضوں کی ادائیگی میں جاتی ہے تو کل نوبت یہاں تک پہنچا دی جائے گی کہ ۱۰۰ فیصد دے کر بھی جان نہ چھوٹے گی۔ انہی قرضوں کی خاطر' سامانِ تعیش اور اسلحہ کے حصول کی خاطر' ملکی مفادات کے سودے کیے جاتے رہیں گے' اور انتہائی حسّاس عہدوں پر فائز افراد کو کان پکڑ کے اٹھایا اور بٹھایا جاتا رہے گا' کشمیر کے مجاہد بھائیوں کی مدد سے ہاتھ کھینچا جاتا رہے گا' اسلام دشمن استعمار کے مفادات کی تکمیل کی خاطر خون بہانے کے لیے وہ پاکستانی فوجی "صومالیہ" اور "سعودی عرب" بھیجے جاتے رہیں گے' جن کے اوپر پاکستان کے عوام قرضوں کی ادائیگی کے بعد' اپنی بچی کھچی تقریباً ساری آمدنی نچھاور کردیتے ہیں۔

بینظیر وزیراعظم بن گئی ہیں تو بھی یہ سب کچھ ہوتا رہے گا' نواز شریف بن جاتے تو بھی یہی سب کچھ ہوتا رہتا۔ شاید کچھ فی صد کم ہوتا کہ ہمیں اپنے دوستوں کے اس اصرار سے انکار نہیں کہ وہ برائی تو ہیں لیکن ایک چھوٹی برائی ہیں۔

یہ سب کچھ اب بھی پہلے کی طرح اس لیے ہوتا رہے گا کہ رائے دہندگان نے ایک بار پھر اپنی گردنوں پر انہی تین چار سو سرمایہ دار' جاگیردار' بیوروکریٹ خاندانوں کے افراد کے پیر تسمہ پا کو بٹھا لیا ہے جو آج تک ان کے مقدر کو تاریک سے تاریک تر کرتے چلے آرہے ہیں' اور ملک کی بھلائی و بہتری کو اپنے مفاد کی خاطر داؤ پر لگاتے رہے ہیں۔ ہم عوام کو ان کے اس فعل کے لیے مورد الزام نہیں ٹھہراتے۔ بے شمار تاریخی' سماجی اور نفسیاتی عوامل نے ان کو ایک ایسے روز افزوں شر کے چکر (vicious circle) میں پھنسا دیا ہے جس سے نکلنا بڑا مشکل ہو رہا ہے۔ فساد اور ظلم سے نجات ان کے اپنے مضبوط فیصلہ اور جرات مندانہ اقدام کے بغیر ممکن نہیں۔ اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِھِمْ "حقیقت یہ ہے کہ اللہ کسی قوم کے حال کو نہیں بدلتا' جب تک وہ خود اپنے اوصاف کو نہیں بدل دیتی"۔ (الرعد ۱۳: ۱۱)۔ لیکن اس قوتِ فیصلہ اور جراتِ اقدام کو ہی فساد اور ظلم نے ماؤف کر رکھا ہے۔

اب یہ چکر کیسے ٹوٹے' کہاں سے ٹوٹے' کون توڑے ؟

دوسری طرف وہ جو ظلم اور فساد کی حقیقت سے واقف ہیں، جو اس کی گرفت سے نکلنے کے لیے درکار قوتِ ارادہ اور جراتِ اقدام کو پیدا کرسکتے ہیں، جگا سکتے ہیں، ان میں سے بہت سوں نے سہل انگاری کی خاطر اھون البلیتین کے بہانہ سونے کے بچھڑے گھڑ لیے ہیں، اور انہی سے اپنی امیدیں اور وابستگیاں قائم کرلی ہیں۔ اور خود اپنے درمیان ان کا فسوں پھونکنے میں مشغول ہو گئے ہیں۔ گو سالہ سونے کا ہو تو پرستاروں کی کیا کمی ہو سکتی ہے!

ان انتخابات میں جماعتِ اسلامی نے پاکستان اسلامی فرنٹ کے ذریعہ حصہ لیا تھا۔ لیکن فرنٹ کو بنے تو ابھی جمعہ جمعہ آٹھ دن ہوئے تھے، فرنٹ کے نام کے پیچھے دراصل جماعتِ اسلامی ہی کی تنظیم اور قوت تھی، اسی کا ۵۲ سالہ کام اور پیدا کردہ اثر و نفوذ تھا۔ اگر جماعت اپنے نام سے حصہ لیتی تو بھی نتائج کچھ مختلف نہ ہوتے۔ اس لحاظ سے، جو کچھ ہوا، یہی وہ پہلو ہے جس کا قدرے تفصیل کے ساتھ جائزہ ہم اس موقعہ پر لینا چاہتے ہیں۔

پاکستان اسلامک فرنٹ جیسی کسی تنظیم کی ضرورت اور اس خیال اور سوچ کے بارہ میں ہم فروری ۱۹۹۳ کے شمارہ میں اپنا استدلال پیش کرچکے ہیں۔ اس فرنٹ کے قیام کے بعد، جولائی ۱۹۹۳ کے شمارہ میں ہم نے اس فرنٹ کی نوعیت کی تشریح بھی کی تھی، اور اس سلسلہ میں اٹھنے والے سوالات اور شبہات کا جواب دینے کی کوشش بھی۔ پھر ستمبر ۱۹۹۳ میں، فرنٹ کی انتخابی پالیسی کی توضیح --- یعنی کسی سے اتحاد کے بغیر، فرنٹ کا اپنے تشخص کے بل پر ایک متبادل قوت کے طور پر، تعارف و تشکیل --- اور اس ضمن میں محض پیپلزپارٹی کو ہرانے کی غرض سے، ایک چھوٹی برائی کے طور پر، جناب نواز شریف کے پیچھے نہ لگنے کی پالیسی کے خلاف سوالات اور اعتراضات سے بحث کی گئی تھی۔

ان انتخابات میں اسلامک فرنٹ نے قومی اسمبلی میں کراچی سے ایک، اور سرحد سے ۲ سیٹیں حاصل کیں۔ پنجاب اور بلوچستان سے اسے کوئی سیٹ نہیں ملی، اور کراچی کی سیٹ کے بارہ میں بھی اس حقیقت کا اعتراف ضروری ہے کہ ایم کیو ایم بائیکاٹ نہ کرتی تو یہ بھی نہ ملتی۔ صوبائی اسمبلیوں میں اسے پنجاب سے ۲، اور سرحد سے ۴ سیٹیں ملیں۔

ان نتائج کو ہزیمت سے تعبیر کیا گیا ہے، اور صحیح کیا گیا ہے، خصوصاً ان توقعات کے پیش نظر جو انتخابات سے قبل قائم کرلی گئی تھیں۔ لیکن یہ نتائج ہماری توقعات سے کچھ بعید نہیں۔ ہم نے لکھا تھا کہ

مستقل حکمتِ عملی [یعنی اسلامک فرنٹ ایک علیحدہ قوت کے طور پر انتخابات میں حصہ لے] پیش رفت کے لیے وقت چاہتی ہے' اور انتخابات سر پر کھڑے ہیں۔ ... (ستمبر ۱۹۹۳' ص ۵)

موجودہ حالات میں' جب دو بڑی متحارب قوتیں میدان میں نبرد آزما ہیں' ہمیں یہ جاننا چاہیے کہ ہمارے رائج طریقِ انتخاب کے تحت یہ بھی ممکن ہے کہ ہمیں کوئی قابلِ ذکر کامیابی حاصل نہ ہو۔ (ایضاً' ص ۱۲)

جب معرکہ گرم ہو تو اس سے زیادہ حقیقت گوئی اور حساب کتاب کی گنجائش نہیں ہوتی' اس لیے کہ انتھک محنتوں کے چراغ امیدوں کے تیل سے جلتے ہیں۔

اجتماعی گروہوں کے لیے' تنظیمیں ہوں یا قومیں' اپنی مساعی اور اعمال کے نتائج کو مشیتِ الٰہی کا نتیجہ قرار دے کر بیٹھ جانا صحیح نہیں۔ یقیناً مشیتِ الٰہی کے بغیر تو پتّہ بھی نہیں ہلتا' لیکن دنیاوی نتائج میں بھی یہ مشیت سننِ الٰہی کے مطابق کارفرما ہوتی ہے' اس لیے اس کو اپنی ناکامی کی توجیہہ کے لیے بیساکھی بنانا مناسب نہیں۔

نہ ہم ان گروہوں کے لیے دنیا میں ناکامی کا متبادل آخرت کی کامیابی کو قرار دے کر مطمئن ہو جانے کو صحیح سمجھتے ہیں۔ اس لیے کہ آخرت میں تو ہر انسان انفرادی طور پر جواب دہ ہوگا' اور وہ اپنے اعمال کے مطابق کامیاب یا ناکام ہوگا۔ دنیا میں اجتماعی کامیابی و ناکامی میں نیک و بد سب شریک ہوں گے' آخرت میں لوگ اپنی نیّات و اعمال کے مطابق اٹھائے جائیں گے۔ ہوسکتا ہے کہ ایک لشکر فتح یاب ہو' مگر ایک شہید اپنی ریا کاری یا مالِ غنیمت میں خیانت کی وجہ سے جہنم میں جائے۔ اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ایک لشکر ہزیمت اٹھائے' مگر اس میں شامل ہر فرد اپنے خلوص اور عمل کی وجہ سے جنت میں جائے۔ چنانچہ اجتماعی گروہوں کے لیے کامیابی یا ناکامی یہیں دنیا میں ہے۔ اس نازک مگر اہم حقیقت کو ہم اکثر فراموش کردیتے ہیں۔

ہاں' ایک فرد کے لیے اپنے خلوص و محنت کی بنیاد پر مشیتِ الٰہی کے سہارے راضی بقضا رہنا' اور صرف آخرت میں فوز وجنت ہی پر نگاہ رکھنا' ایمان کا تقاضا بھی ہے' اور صبر اور امید کے دیئے جلائے رکھنے کے لیے ضروری بھی۔

ایسا ہونا بالکل ممکن ہے کہ کسی گروہ سے کوئی کوتاہی سرزد نہ ہو' پھر بھی وہ ناکام ہو جائے' اور قوم اسے رد کردے۔ ایسا انبیا کے ساتھ ہوا ہے۔ لیکن ہم جیسے ناقص انسانوں کو تو اپنی شکست کو قوم کی شکست قرار دینے' اس کا الزام قوم کی خامیوں کے سر ڈالنے' اور باطن کے بجائے خارج

میں اسباب تلاش کرنے سے پہلے خود اپنے گریبان میں منہ ڈالنا چاہیے۔ اجتماعی گروہوں کے لیے ہر کام، اور خصوصاً ہر معرکہ، کے بعد اجتماعی خود احتسابی لازمی ہے۔ یہ خود احتسابی ہی پیش رفت اور فتح و غلبہ کی کلید ہے۔ یہی استغفار کا پہلا قدم ہے۔ استغفار ہی طلوعِ سحر کی نوید ہے۔ استغفار کے ساتھ ہی قوت پر قوت، اموال و تعداد میں اضافہ، آسمان سے بارشیں اور برکتوں کے نزول، اور زمین سے رزق کی بخشائش جیسے وعدے وابستہ کیے گئے ہیں۔

ہر نفس ڈرتا ہوں اس امت کی بیداری سے میں
ہے حقیقت جس کے دیں کی احتسابِ کائنات

اسی لیے ہر معرکہ، جنگ کے بعد، فتح ہو یا شکست، اور ہر اہم اجتماعی واقعہ کے بعد قرآن مجید نازل ہوتا، اور احتساب کا کام کرتا۔ اسی لیے ایسے بندوں کے بارہ میں بھی جنہیں "ربّانی" قرار دیا گیا، اور ان کی مدح اعلیٰ ترین الفاظ میں کی گئی، یہ کہا گیا کہ ہر معرکہ کے بعد ان کا شعار یہ تھا کہ

وَمَا كَانَ قَوْلَهُمْ اِلَّآ اَنْ قَالُوْا رَبَّنَا اغْفِرْلَنَا ذُنُوْبَنَا وَاِسْرَافَنَا فِيْٓ اَمْرِنَا وَثَبِّتْ اَقْدَامَنَا

(آل عمران ۳ : ۱۴۷)

ان کی دعا بس یہ تھی کہ "اے ہمارے رب! ہماری غلطیوں اور کوتاہیوں سے درگزر فرما، ہمارے کام میں تیرے حدود سے جو کچھ تجاوز ہوگیا ہو، اسے معاف کردے، ہمارے قدم جما دے۔

اور اسی لیے فتح کے آخری مرحلہ میں، جب يَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا کا منظر سامنے آگیا، تو حمد کے ساتھ استغفار کا حکم ہوا۔ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ "اپنے رب کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کرو، اور اس سے مغفرت کی دعا مانگو" (النصر ۱۱۰ : ۳)۔

یہ ملحوظ رکھنا بھی ضروری ہے کہ جنگ یا انتخاب جیسے معرکے فتح کے لیے لڑے جاتے ہیں۔ اگر مقصود صرف دعوت و تبلیغ یا اصلاح و تعمیرِ معاشرہ ہو، تو یہ معرکے کوئی مناسب ذرائع نہیں کیونکہ ان کی روح تو حریفانہ چشمک و کشمکش ہوتی ہے، جو تبلیغ و اصلاح کے ابتدائی مراحل میں کچھ زیادہ مفید نہیں۔ کچھ لوگ کہتے رہتے ہیں کہ ہمیں انتخاب کے عمل میں حصہ تو ضرور لیتے رہنا چاہیے --- خواہ ایک سیٹ بھی نہ ملے --- کیونکہ اگر ہم نے اس کو ترک کردیا تو دین اور سیاست علیحدہ ہو جائیں گے۔ اور جو لوگ عوام میں نفوذ بڑھانے اور زیادہ سے زیادہ سیٹیں جیتنے کو انتخابات کا ہدف قرار دیتے ہیں، یہ ان پر اقتدار کے لالچ اور عجلت کا الزام بھی لگاتے ہیں۔ یہ موقف ہماری دانست میں غلط سوچ پر مبنی ہے۔ نہ سیاست صرف انتخابات میں شرکت کا نام ہے،

نہ عدم شرکت سے کوئی غیر سیاسی بن جاتا ہے۔ سیاست میں بھرپور شرکت کے ہزار راستے ہیں۔ نہ سیٹوں کی صورت میں کامیابی سے بے نیاز ہو کر انتخابات میں شرکت کوئی معقول یا منطقی روش ہے۔ ہم کو فتح محبوب ہونا چاہیے' زیادہ سے زیادہ سیٹیں جیتنے کے لیے تمام ممکنہ تدابیر اختیار کرنا چاہئیں' الاّ یہ کہ وہ خلافِ اسلام ہوں' اس مقصد کے لیے اپنی عقل استعمال کرنا چاہیے۔ ہاں' اس کے باوجود ایک سیٹ بھی نہ ملے تو کوئی پروا نہ ہونا چاہیے' کہ ہم نے اپنی عقل اور بدن پر اللہ کا حق ادا کرنے کی اپنی سی کوشش کر دی۔

چنانچہ ہمارے لیے ضروری ہے کہ نتائج کے لحاظ سے ناکامی کو ناکامی سمجھیں' اسے مشیتِ الٰہی یا فوزِ آخرت کے سہارے نہ ٹال دیں اس کے اسباب و علل تلاش کریں' ان کا علاج کریں۔ اپنی غلطیوں کے تعین اور ان کے مناسب اعتراف سے ہماری قوت' ساکھ اور عزت میں اضافہ ہوتا ہے' کمی نہیں۔

اسباب و علل تین طرح کے ہوتے ہیں۔ اوّل اخلاقی اسباب' یعنی وہ جن کا تعلق دین و اخلاق سے ہوتا ہے۔ دوم' تدبیری اسباب' یعنی جن کا تعلق حکمت' حکمتِ عملی اور تدابیر سے ہوتا ہے۔ سوم' مادی اسباب' جن کا تعلق مادی وسائل و ذرائع سے ہے۔ ہماری دانست میں اللہ تعالیٰ نے اجتماعی گروہوں کی کامیابی اور ناکامی اور ان کی طاقت یا ضعف کے اسباب میں اخلاقی اسباب کو فیصلہ کن قرار دیا ہے۔ سب سے پہلے ہم انہی سے بحث کریں گے۔ اس کے بعد حکمت و تدابیر کا دخل ہے۔ مادی وسائل کا بھی ایک مقام ہے۔ لیکن اس وقت ہم ان کو نظرانداز کریں گے۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ وسائل کے لحاظ سے ہمارا دو بڑی طاقتوں سے کوئی مقابلہ نہ تھا۔ لاہور کی دو چار سیٹوں پر جو وسائل ان کے امیدواروں نے لگائے' وہ ہماری ملک گیر مہم کے اخراجات سے کہیں زیادہ ہیں۔

---

۱ - اخلاقی اسباب میں سرفہرست اخلاص و ایمان ہے۔ اللہ تعالیٰ نے استخلاف کے وعدہ کو يَعْبُدُونَنِي لَا يُشْرِكُونَ بِي شَيْئًا "پس وہ میری بندگی کریں اور میرے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں" (النور ۲۴ : ۵۵) کے ساتھ مشروط کیا ہے۔ علوو غلبہ کو ایمان پر منحصر کیا ہے۔ أَنتُمُ الْأَعْلَوْنَ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ "تم ہی غالب رہو گے اگر تم مومن ہو" (آل عمران ۳ : ۱۳۹)۔ نصرتِ الٰہی کو تقویٰ اور صبر کے ساتھ وابستہ کیا ہے' جو اخلاص و ایمان ہی کے ثمرات ہیں (آل عمران ۳ : ۱۲۵)۔ ناکامی کے اسباب میں حبِ دنیا اور کثرتِ تعداد پر بھروسہ جیسی صفات کو بیان کیا' جو اخلاص

کے منافی ہیں (آل عمران ۳ : ۱۵۲، التوبہ ۹ : ۲۵، ۳۸) اور مشیت و تدابیرِ الٰہی کی کارفرمائی پر یقین میں اس حد تک اخلاص کی تعلیم دی کہ "پس حقیقت یہ ہے کہ تم نے انہیں قتل نہیں کیا، بلکہ اللہ نے ان کو قتل کیا اور اے نبیؐ تو نے نہیں پھینکا بلکہ اللہ نے پھینکا (اور مومنوں کے ہاتھ جو اس کام میں استعمال کیے گئے) تو یہ اس لیے تھا کہ اللہ مومنوں کو ایک بہترین آزمائش سے کامیابی کے ساتھ گزار دے، یقیناً اللہ سننے اور جاننے والا ہے" (الانفال ۸ : ۱۷)۔

یہ بڑا نازک راستہ ہے۔ ایک طرف کامیابی مطلوب و محبوب ہونا چاہیے، کامیابی کے لیے ہر ممکن تدبیر اختیار کرنا چاہیے، بلکہ جان لڑا دینا چاہیے، اپنے ساتھ لانے کے لیے لوگوں کے پیچھے جانا چاہیے، لوگوں کو جوق درجوق دین میں داخل کرنے کے لیے کوشاں ہونا چاہیے۔ دوسری طرف ان میں سے کسی چیز کو فی نفسہٖ مقصود نہ ہونا چاہیے کہ معبود کا درجہ حاصل کرے، اور معبودِ حقیقی سے غفلت و استغنا پیدا کردے۔

اس معاملہ میں افراد کی حد تک افراد ہی اپنا احتساب کرسکتے ہیں۔ اجتماعیت کی حد تک اجتماعیت کو کرنا چاہیے۔ ہمیں اس پہلو سے اپنے اندر بہت کمی محسوس ہوتی ہے۔ خدمتِ خلق کا کام کرتے ہوئے یہ جملہ زبان پر آ ہی جاتا ہے کہ "کتنی ہی خدمت کرلیں، مگر ووٹ نہیں دیتے۔" سمجھنے لگتے ہیں کہ تعداد و وسائل کے بغیر کامیابی ممکن نہیں۔ کامیابیوں کو اپنا کارنامہ سمجھتے ہیں۔ دنیا کی محبت بھی ہے۔

کامیابی کے لیے للّٰہیت شرطِ اوّلین ہے۔ دراصل ذکر تو یہی ہے کہ ہر وقت نگاہ وجہِ ربِ الاعلیٰ پر جمی رہے، اس کا حکم دیا گیا ہے کہ جب مقابلہ ہو تو اللہ کو کثرت سے یاد رکھو تاکہ کامیاب ہو۔ (الانفال ۸ : ۴۵) ہم اللہ کے بن جائیں گے، تو اللہ ہمارا بن جائے گا۔ اللہ ہمارا بن جائے گا تو دنیا ہماری بن جائے گی، کہ لوگوں کے دل اس کی مٹھی میں ہیں، پل بھر میں جدھر چاہے پلٹ دے۔ جس طرح قتل کرنے کے لیے تلوار چلانا ضروری ہے، لیکن فرمایا گیا، تم نے قتل نہیں کیا، بلکہ اللہ نے قتل کیا، اسی طرح لوگوں کو مسخر کرنے کے لیے تقریر، تحریر، جلسے جلوس، اشتہار ضروری ہیں۔ لیکن یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ ان سے لوگ مسخر ہو جائیں گے یا ہوگئے۔ امام غزالیؒ کے الفاظ میں توکل ترکِ اسباب کا نام نہیں، ترکِ رویتِ اسباب کا نام ہے۔

کامیابی کو محبوب رکھنا لیکن معبود نہ بنانا، اسباب اختیار کرنا مگر ان کو ارباب نہ بنانا، تدابیر اختیار کرنا مگر ان کو کارگر نہ سمجھنا --- یہ پل صراط سے زیادہ نازک راستہ ہے، لیکن نصرتِ الٰہی کے لیے ناگزیر ہے۔

۲ ۔ کامیابی کے لیے دوسرا لازمی وسیلہ مومنین کا ایسا گروہ ہے جن کے دل الفت کے رشتہ میں ایک دوسرے کے ساتھ جڑے ہوئے ہوں، جو سمع و طاعت اور نظم و ضبط کے پابند ہوں، جو بنیان مرصوص ہوں۔ هُوَالَّذِیٓ اَیَّدَکَ بِنَصْرِهٖ وَبِالْمُؤْمِنِیْنَ ○ وَاَلَّفَ بَیْنَ قُلُوْبِهِمْ "وہی تو ہے جس نے اپنی مدد سے اور مومنوں کے ذریعہ سے تمھاری تائید کی اور مومنوں کے دل ایک دوسرے کے ساتھ جوڑ دیے" (الانفال ۸: ۶۲، ۶۳)۔ فتح کی بشارت ایک ایسی جماعت کو دی گئی جو رُحَمَآءُ بَیْنَهُمْ کی تصویر ہو (الفتح ۴۸: ۲۹)۔ باہمی الفت و رحمت کو خراب کرنے والی ساری چیزوں کو حرام کردیا گیا (الحجرات ۴۹: ۱۰ تا ۱۲)۔ وحدت و استحکام کی خاطر اطاعت کا حکم دیا، اور باہمی تنازع کو حرام قرار دیا۔ فرمایا "اور اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کرو اور آپس میں جھگڑو نہیں، ورنہ تمہارے اندر کمزوری پیدا ہو جائے گی اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی۔ صبر سے کام لو، یقیناً اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے" (الانفال ۸: ۴۶)۔ مزید فرمایا "اللہ نے (تائید و نصرت کا) جو وعدہ تم سے کیا تھا، وہ تو اس نے پورا کردیا۔ ابتدا میں اس کے حکم سے تم ہی ان کو قتل کررہے تھے۔ مگر جب تم نے کمزوری دکھائی اور اپنے کام میں باہم اختلاف کیا، اور جونہی کہ وہ چیز اللہ نے تمہیں دکھائی جس کی محبت میں تم گرفتار تھے (یعنی مالِ غنیمت)، تم اپنے سردار کے حکم کی خلاف ورزی کر بیٹھے --- اس لیے کہ تم میں سے کچھ لوگ دنیا کے طالب تھے اور کچھ آخرت کی خواہش رکھتے تھے --- تب اللہ نے تمہیں کافروں کے مقابلہ میں پسپا کردیا تاکہ تمہاری آزمائش کرے۔ اور حق یہ ہے کہ اللہ نے پھر بھی تمہیں معاف ہی کردیا کیونکہ مومنوں پر اللہ بڑی نظرِ عنایت رکھتا ہے" (آلِ عمران ۳: ۱۵۲)۔

اس پہلو سے اپنا جائزہ لیا جائے تو یہ کہا جاسکتا ہے کہ اگر شکست نہ ہوتی تو تعجب کی بات ہوتی۔ سب نہیں، اکثریت بھی نہیں، لیکن ایک خاصی معقول تعداد، جس میں اکابر بھی ہیں اور اصاغر بھی، پرانے تربیت یافتہ بھی ہیں اور نوواردین بھی، ان سارے احکام کی خلاف ورزی میں ملوث رہی ہے۔

یہ کیفیت کوئی آج کی بات نہیں کہ موجودہ امارت، پاسبان اور فرنٹ جیسے مسائل کی وجہ سے ہو۔ پہلے سمع و طاعت اور نظم و ضبط تو رہا ہے، احتساب اور گردنیں پکڑنے کا رواج بھی رہا ہے، مگر الفت و محبت کی کمی ہمیشہ رہی ہے۔ اب ایک عرصہ سے مثالی نظم بھی ہاتھ سے جارہا ہے۔ لیکن پہلے بھی کسی جگہ جب اختلاف ہو جاتا --- افراد کے درمیان ذاتی ہو، اصول و احکام کی تعبیر میں ہو، تدابیر و مصالح کے تعین میں ہو --- پھر دیکھیے: دل کس طرح پھٹ جاتے تھے، مشہورِ

زمانہ نظم و ضبط کے بندھن بھی ٹوٹ جاتے تھے، لب و لہجہ بدل جاتا تھا، سخت سے سخت الفاظ استعمال کرنے سے دریغ نہ ہوتا تھا۔

آج کی کیفیت کی ایک جھلک ۱۹۵۷ کے قائم مقام امیرِ جماعت چودھری غلام محمدؒ کے الفاظ میں دیکھی جاسکتی ہے،

> بعض لوگوں نے شوریٰ کی کارروائیوں کے متعلق بالکل غلط اور بے بنیاد تاثرات دیے۔ بعض لوگوں نے قرار داد کے متن کی ایسی تاویل کرنے کی کوشش کی جو اس کی منشا کے خلاف تھی۔ بعضوں نے شوریٰ کے ارکان کی طرف غلط باتیں منسوب کرنے سے بھی دریغ نہیں کیا... بعض نے شدتِ تاثر میں اپنے جذبات پبلک پر ظاہر کردیے۔ ان ساری باتوں نے مل ملا کر چند دنوں کے لیے جماعت کے مزاج کو اس طرح بگاڑ دیا کہ لوگوں کے ذہن ہر طرح کی باتیں قبول کرنے اور ہر طرح کی باتیں پھیلانے کے لیے بے قید ہوگئے، اور شریعت اور اخلاق کے حدود کی بھی پروا بہت کم رہ گئی۔ (مرکزی سرکلر مورخہ ۱۶ جنوری، ۱۹۵۷)

اختلاف سے کسی تنظیم کو مفر نہیں، لیکن مضبوط نظم کے لیے الفت، سمع و طاعت، اور شوریٰ کے بعد سب سے زیادہ ضروری صفت تو یہی ہے کہ وہ اختلاف کو سہار جائے، اور لوگ اختلاف کے باوجود شیروشکر ہوکر، دو کناروں کے درمیان، اپنی منزل کی طرف رواں رہیں۔ تعبیرات کے اختلاف عقل و نقل کے استدلال کے علاوہ اور کس طرح حل ہوسکتے ہیں ؟ اس کے باوجود حل نہ ہوں، اور ان کا تعلق اجتماعی پالیسی سے ہو، یا دیگر پالیسی، تدابیر اور مصالح کے اختلاف ہوں، تو شورائیت کے علاوہ حل کا اور کیا راستہ ہوسکتا ہے ؟ یہی راستہ شریعت نے ہمیں بتایا ہے۔ افراد اپنے کو کتنا ہی برسرِحق سمجھتے ہوں، یا واقعتاً ہوں بھی، اجتماعی فیصلوں کے آگے سرِتسلیم خم نہ کریں تو پھر نزاعات کا کوئی حل ممکن نہیں۔ پھر تو، محترم نعیم صدیقی صاحب کے الفاظ میں "افتراق ہی افتراق اور فساد ہی فساد ہے... دل و دماغ میں زہریلے آبلے پڑ جائیں گے اور زندگی آگ کے شعلوں سے بھر جائے گی۔ وہ چہرے جن پر مسکراہٹوں کے پھول کھلنا چاہئیں، ان پر نفرت کے تارکول کا غبار چپک جائے گا۔ اس غبار کو اگر دنیا میں صاف نہ کیا جائے تو خدانخواستہ آخرت تک ساتھ جاسکتا ہے۔"

دلوں میں الفت کے بجائے دوری کا کیا عالم ہے ؟ شوریٰ اگر ان کی رائے اور مرضی کے مطابق فیصلے نہ کرے تو اسے ربراسٹمپ قرار دینے میں کوئی تامل نہیں، اخباری کالموں اور نظموں

میں دل کا غبار نکالنے سے بھی کوئی دریغ نہیں۔ فیصلوں کو مشکوک و مشتبہ بنانے کی بھی ہر ممکن کوشش جائز ہوگئی ہے۔ اطاعتِ امر کی تعلیم دی تو یوں گئی کہ جب تک اربابِ امر "کتاب و سنت سے کھلم کھلا انحراف نہ کریں' ان کے احکام اور ہدایت سے سرتابی کرنا' یا ان کی اطاعت بہ طوع و رغبت کرنے کے بجائے بددلی کے ساتھ کرنا' یا ان کے لیے خیر خواہانہ جذبات رکھنے کے بجائے کینہ و نفرت کے جذبات دلوں میں رکھنا' ان کے خلاف سازشیں کرنا' ان کی غیبت کرنا' ان کے متعلق بددلی پھیلانا . . . یہ کچھ کبیرہ گناہوں میں داخل ہے . . . ان کی وجہ سے . . . عاقبت تباہ ہو سکتی ہے"۔ پھر' کیا یہ سب کام نہ کیے گئے ؟ بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰی نَفْسِہٖ بَصِیْرَۃٌ ○ وَّلَوْ اَلْقٰی مَعَاذِیْرَہٗ "بلکہ انسان خود ہی اپنے آپ کو خوب جانتا ہے چاہے وہ کتنی ہی معذرتیں پیش کرے" (القیامہ ۷۵ : ۱۴' ۱۵)۔

شکست کے اسباب موسیقی' تصویر اور بھنگڑہ جیسے صغائر کے مقابلہ میں ان کبائر میں کیوں نہ تلاش کیے جائیں ؟ بلکہ یہ فہرست تو اور طویل کی جاسکتی ہے : گروہ بندی اور نجویٰ' بہتان اور افترا' تجسس اور بدظنی' بلا تحقیق الزامات پر یقین اور ان کی اشاعت' غیبت' ھمز اور لمز ---- اور سب سے بڑھ کر عہدِ رکنیت اور قواعد و ضوابط کی صریح خلاف ورزی۔ اجتماعی زندگی ان امراض کا شکار ہو' تو کامیابی کا خواب کیسے پورا ہوسکتا ہے ؟

۳ - یہ بات ظاہر ہے کہ اللہ کی معصیت کے ذریعہ اس کی رضا اور اس کی نصرت حاصل نہیں ہوسکتی۔ اوپر ہم نے جن چیزوں کا ذکر کیا ہے وہ سب تو کبائر کے زمرہ میں آتے ہی ہیں' اور بھی چند امور ہیں جن کا نوٹس لینا ضروری ہے۔

(الف) عدل و قسط کی شہادت اور اس کا قیام ہی دین کا اور اس امت کا مقصد ہے۔ اسی لیے عدل اور احسان کا امر کیا گیا ہے' کہا گیا ہے کہ جب بات کرو تو عدل کے ساتھ کرو اگرچہ خود اپنے نفس کے' یا اپنے قرابت داروں کے' یا اپنے گروہ کے خلاف بات جاتی ہو۔ ہدایت کی گئی ہے کہ کسی بدترین دشمن کے ساتھ دشمنی بھی تمھیں عدل کے مقام سے نہ ہٹائے۔ بے لاگ عدل پر کاربند رہنے کے اس حکم کی خلاف ورزی بھی عرصہ سے کی جاتی رہی ہے۔

جن سے ہمارا سیاسی اختلاف ہوا' ہم نے ان کے خلاف بات کرنے میں عدل و احسان کے تقاضے یاد نہ رکھے۔ ہم بھی بلا ثبوت مخالفین کو غدار قرار دیتے رہے' اور ان پر ہر نوع کے الزامات عائد کرتے رہے۔ ان پر ظلم ہوا' ہم نے اپنے سیاسی مفاد میں اس ظلم کے خلاف زبان نہ کھولی۔ بینظیر بھٹو کی حکومت کو گرانے کے لیے نواز شریف نے ہارس ٹریڈنگ کی تو ہم خاموشی

اختیار کیے رہے۔ ۸۸ اور ۹۰ میں نگراں حکومتوں نے اپنا اقتدار اور اپنے وسائل کھلم کھلا ایک جماعت کو کامیاب کرانے کے لیے استعمال کیے' ہم نے کوئی صدائے احتجاج نہ بلند کی۔

پیپلزپارٹی کے خلاف سارے الزامات تسلیم' لیکن کسی پارٹی کی دشمنی کو ایمان و عقیدہ کا جز بنا لینا خلافِ ایمان ہے' اور اس کے خلاف نفرت کا زہر گھول گھول کر پلانا دعوت کے مقام و اخلاق کے منافی۔ بلکہ یہ سیاسی حکمت کے بھی منافی ہے کہ ملک کی بڑی سیاسی جماعت کے ساتھ مستقل نفرت و عداوت کا تعلق ہو۔ ہم یہ کام بھی کرتے رہے' یہاں تک کہ ایک دن آگیا کہ جب ہم نے اپنے ووٹ بینک کو سیاسی دشمنی اور دوستی سے بالاتر ہو کر اصول اور مفادِ ملی میں اپنا ساتھ دینے کے لیے پکارا' تو پیپلزپارٹی کی دشمنی میں خود جماعتِ اسلامی کے ووٹر نے جماعتِ اسلامی کو ووٹ دینے سے انکار کر دیا۔

(ب) اللہ تعالیٰ نے داعی کو جن اخلاق کی تعلیم دی ہے ان میں یہ بھی ہے کہ فرعون سے بھی نرم بات (قولِ لیّن) کرو' عفو و درگزر کا شیوہ اختیار کرو' جاہلین سے اعراض کرو۔ اس نے خود جہاں لیڈروں پر تنقید کی تو سوائے ابولہب کے کسی کا نام لے کر نہیں کی اور یہ کہنے کے بجائے کہ فلاں اور فلاں تمھیں گمراہ کر رہے ہیں' یوں کہا کہ "تم کو گمراہ کیا جارہا ہے۔" بتوں کو گالی دینے سے بھی روکا۔ اس اعتراف میں کوئی تامل نہ ہونا چاہیے کہ ہم اپنی انتخابی مہم میں ان داعیانہ اخلاق کو ملحوظ نہ رکھ سکے۔

(ج) تصویر اور موسیقی کا استعمال بھی اسی معصیت کے زمرہ میں آتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ یہ اختلافی مسائل ہیں' لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ ہمارے دیار کے علما ان کے منکر ہونے پر تقریباً متفق ہیں' اور عامتہ المسلمین کے ذہنوں میں بھی یہی خیال پایا جاتا ہے۔ ہمارے ہاں جو منافقت رائج ہے اس کی وجہ سے خواہ عوام خود تو رقص و موسیقی اور فلم و تصویر میں کتنے ہی بے محابا ملوث ہوں' مگر چاہتے ہیں کہ جو دین کا نام لیں وہ اجتناب کریں۔ خصوصاً وہ حلقہ جو تحریک کے متاثرین کا حلقہ ہے۔ اس لیے ضروری استعمال کے علاوہ اس انداز میں اور اس پیمانہ پر ان کا استعمال بھی صحیح نہ تھا۔

لیکن اس ضمن میں یہ بات بھی قابل غور ہے کہ جو اٹھتا ہے اور کہتا ہے کہ جماعت کا دینی تشخص مجروح ہو گیا' اخلاقی ساکھ گر گئی' وہ سرفہرست تصویر' موسیقی' بھنگڑا' دھمال اور دیگر ثقاہت سے گرے ہوئے افعال کا ذکر کرتا ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ ان کے معصیت ہونے سے اختلاف کی گنجائش نہیں' مگر دینی تشخص کا سارا انحصار ان پر رکھنا بجائے خود ایک بگاڑ کی علامت ہے۔ اعمال میں ایک مدارج کا نظام ہے' اور سید مودودیؒ تو ہمہ وقت اس ظاہری دینداری کے مخالف

رہے جو ظاہری فروعیات کو اصل دین کا مقام دیے رہے' اور وہ کھوٹے سکوں پر اشرفی کی مہر لگانے کے بجائے زرِخالص کے سکے ڈھالنے کے داعی رہے۔ کیا نقضِ عہد رکنیت سے دینی تشخص مجروح نہیں ہوتا ؟ کیا غیبت' جماعتی فیصلوں کے خلاف نجوی اور اخباری بیانات اور کالموں میں مہم سے اخلاقی ساکھ نہیں گرتی ؟ جو نوجوان ان منکرات میں ملوث ہوئے' اور جن کو ہم شدت سے روکتے رہے' وہ ہم کو پلٹ کر یہی جواب دیتے : "فلاں تربیت یافتہ بزرگ یوں سنی سنائی باتوں پر بہتان و اتہام کی اشاعت میں مشغول ہیں' فلاں فلاں بزرگ اخبارات میں جماعتی فیصلوں کے خلاف لکھ بول رہے ہیں' فلاں بزرگ جماعت کے قائدین کو ایجنسیوں کا ایجنٹ قرار دے رہے ہیں' فلاں امیر' امیرِجماعت کا نمائندہ ہونے کے باوجود' کھلم کھلا جماعتی فیصلوں کے خلاف بولتے ہیں۔ امیرِ جماعت کو بدلنے کی مہم بھی چلا رہے ہیں اور اپنے مناصب و منافع سے بھی چمٹے ہوئے ہیں۔ تو کیا ہم چھوٹے ہی گناہگار اور گردن زدنی ہیں ؟ اگرچہ ایک غلطی سے دوسری غلطی جائز نہیں ہو جاتی' مگر فی الواقع ان کو جواب دینا مشکل ہوتا تھا۔

یہ حقیقت ہے کہ جماعتِ اسلامی کے اپنے ووٹ بینک کے ایک بڑے حصہ نے جناب نواز شریف کے حق میں ووٹ دیا۔ ان میں ارکانِ جماعت بھی شامل ہیں۔ لیکن اس کی یہ توجیہ غلط ہے کہ انہوں نے ایسا اس لیے کیا کہ وہ فرنٹ بنانے کے مخالف تھے۔ کوئی منصف مزاج آدمی اس سے انکار نہیں کرسکتا کہ اگر جماعتِ اسلامی اپنے پروگرام اور تشخص کی بنیاد پر الیکشن لڑ رہی ہوتی تو بھی نتیجہ یہی نکلتا۔ اگر اسلامک فرنٹ نہ ہوتا' اگر پاسبان اور اس کے کام نہ ہوتے' اگر انتخابی مہم میں ثقاہت سے گرے ہوئے انداز و اطوار اور پروگرام نہ ہوتے' اگر تصویر و موسیقی کا استعمال نہ ہوتا' اگر سرخ پٹی والے پرچم کے بجائے کلمہ طیبہ والا پرچم ہوتا' اگر ہم مہم بالکل ۱۹۷۰ کے انداز میں چلاتے' تب بھی نتائج آج یا ۱۹۷۰ سے مختلف نہ ہوتے۔ ۱۹۷۷ میں' ۱۹۸۸ اور ۱۹۹۰ میں ہمارے ان ووٹرز کے دل جنھوں نے آج ان سارے الزامات کے بہانے نواز شریف کو ووٹ دیے' اس بات سے شق نہ ہوئے کہ اب ان کے ہاتھوں میں کلمہ طیبہ کے بجائے نوستاروں کا پرچم ہے جن میں بیگم ولی خان اور اصغرخان بھی شامل ہیں۔ یہ بات ان کے دین و ایمان پر گراں نہ گزری کہ ہم ان کو ووٹ دے رہے ہیں اور دلوا رہے ہیں جو صرف پایہ ثقاہت سے گری ہوئی حرکات کے مجرم نہیں' بلکہ شرابی' بدکار' اسمگلر' تارک فرائض' مرتکبِ کبائر' فاسق اور فاجر مسلمان ہیں۔ ان انتخابات میں فوٹو بھی تھے اور قدِ آدم تصاویر بھی' گانے بھی تھے اور رقص بھی

--- اور یہ سب "ہماری" پی این اے اور آئی جے آئی کے نمائندے تھے --- لیکن ہمیں ان منکرات کو نظرانداز کرنے میں کوئی تامل نہ ہوا۔ ۱۹۸۸ اور ۱۹۹۰ میں ہمارے ارکان کے قدِ آدم پورٹریٹ ان کے حلقوں میں آویزاں تھے' ان پر کوئی صدائے احتجاج بلند نہ ہوئی۔ ۱۹۹۰ میں بھی ماں بیٹی کے بارہ میں غلیظ الفاظ استعمال کیے گئے' مجھے صرف ایک دبادبا احتجاج موصول ہوا تھا۔ خدا کے لیے' آپ کوئی بھی موقف اختیار کریں' تضاد اور منافقت سے تو خود کو پاک رکھیں کہ سیّد مودودیؒ کی دعوت کا ایک بنیادی نکتہ یہی ہے۔ میں کہتا ہوں کہ وہی سب کچھ ہوتا کہ جس کے خلاف آج کالم سیاہ کیے جارہے ہیں' اور جماعت کے بعض ارکان امیرِ جماعت کے خلاف مہمات چلارہے ہیں' لیکن صرف اگر قاضی حسین احمد' نواز شریف کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر کھڑے ہوجاتے' تو ان سارے گناہوں پر پردہ پڑ جاتا' فرنٹ بھی قبول ہوتا اور اس کا پرچم بھی' پاسبان بھی اور اس کے نوجوان بھی' اور ظالم' بدکار و شرابی اور حرام کھانے والے امیدوار بھی سرآنکھوں پر ہوتے (بلکہ اب بھی اس کردار کے لوگوں کو ارکان تک نے ووٹ ڈالے)۔

اس بات کا احساس ضروری ہے کہ معیارِ حب و بغض' اللہ اور اس کے رسولؐ نہیں تھے' ان کے احکامات بھی نہیں' بلکہ صرف پیپلزپارٹی کی نفرت اور نواز شریف کی محبت تھی۔ "**وَأُشْرِبُوا فِي قُلُوبِهِمُ الْعِجْلَ**: اور ان کی باطل پرستی کا یہ حال تھا کہ دلوں میں ان کے بچھڑا ہی بسا ہوا تھا" (البقرہ ۲ : ۹۳) کی کیفیت تھی' اسی لیے "**سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا**: ہم نے سن لیا' مگر مانیں گے نہیں" (ایضاً) کی روش بھی ہوئی۔

صرف ان انتخابات کے نتائج کی بنیاد پر فرنٹ کی ناکامی کا فیصلہ کردینا اور اس حکمتِ عملی کو ترک کردینا ایک سراسر غیر معقول روش ہوگی۔ ہاں' دوسرے دلائل کی بنیاد پر اس کی مخالفت بھی کی جاسکتی ہے اور حمایت بھی' ترک بھی کیا جاسکتا ہے اور جاری بھی رکھا جاسکتا ہے۔

اگر ہم حقیقت پسند ہوں تو جو اہم سوالات ہمارے غوروفکر کا مرکز بننا چاہئیں' اور جن سے نظریں چرا کر ہمیں اس مرحلہ سے نہیں گزر جانا چاہیے' ان میں نہ فرنٹ کے نام سے ایک سیاسی تنظیم کا قیام ہے' نہ پاسبان کی طرح کی ایک نوجوانوں کی تنظیم کا' نہ پاسبان کی روش اور ثقافت کا' نہ انتخابی مہم کا' نہ نواز شریف سے اتحاد اور مفاہمت کا۔

وہ سوالات یہ ہیں :

۱۔ پہلا سوال یہ ہے کہ ہم نے چن چن کر اور چھانٹ چھانٹ کر' اور چھلنیاں لگا لگا کر اور

برسوں دروازوں پر کھڑا رکھ کر' یہ کیسے افراد پر مشتمل کیسی مثالی تنظیم بنائی ہے ؟ اور کیوں ؟

جہاں ہم تدبیر و حکمتِ عملی کے ایک سنگین اختلاف سے کامیابی سے نہیں گزر سکتے۔

جہاں اپنی رائے پر اتنا اصرار ہے کہ سارے ادارے ایک طرف' میری رائے ایک طرف' اس کو ضرور چلنا چاہیے۔

جہاں اللہ رب العالمین کو گواہ کرکے اقرار کرنے والوں کو کھلم کھلا احکامِ جماعت کی خلاف ورزی میں تامل نہیں۔

جہاں معاملات میں محرمات کے ارتکاب پر پیشانی شکن آلود نہیں ہوتی' جہاں سود کی حرمت کے خلاف صدا بلند ہوتی رہتی ہے مگر سینما' موسیقی' تصویر ایسے کبائر بن گئے ہیں جو ناقابل برداشت ہیں۔

۲ - دوسرا سوال یہ ہے کہ ۵۲ سالہ جدوجہد کے بعد ہم نے یہ جو اتنا سکڑا ہوا اور ناقابل اعتبار حلقہ متفقین (ووٹ بینک) بنایا ہے' اس کی وجہ کیا ہے ؟ جو وسیع تر بینک ہم اپنا سمجھتے ہیں' اس کا بڑا حصہ کراچی میں پھسل کر ایم کیو ایم کی طرف چلا گیا' اور پنجاب میں نواز شریف کی طرف۔ اس کو اپنے سے زیادہ غیروں پر اعتماد ہے' ان سے محبت ہے۔ یہ ووٹ دیتے وقت سارے تطہیر شدہ افکار' نظریات' اور احکام شریعت کو فراموش کرسکتے ہیں۔ بات تلخ لگتی ہے مگر حقیقت تو یہ ہے کہ اس سے کہیں زیادہ وفادار اور ثابت قدم تو پیپلزپارٹی کا ووٹ بینک ثابت ہوا' جو ۱۹۷۰ سے اسی طرح قائم ہے۔

مولانا مودودیؒ نے اپنی تحریروں میں کئی جگہ مسلمانوں اور تحریک اسلامی کے وابستگان کو نازیوں اور فاشسٹوں کی قربانیوں اور اپنے مقصد سے وفاداریوں کی مثالیں دے کر ان کی غیرت کو جگایا ہے۔ ہم بھی یہ بات اسی مقصد کے لیے لکھ رہے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ پیپلزپارٹی کے ووٹرز کی وفاداری پر تو غالب کا یہ شعر صادق آتا ہے کہ

وفاداری بشرطِ استواری اصل ایمان ہے
مرے بت خانہ میں تو کعبہ میں گاڑو برہمن کو

۳ - تیسرا سوال یہ ہے کہ اگر ہم نہ عامتہ المسلمین کو اپنے اندر جذب کرنے کو تیار ہوں' نہ ہم ان کی رائے کے مطابق سیاسی پالیسی اختیار کرنے کو تیار ہوں' تو پھر رائے عامہ کے بل پر تبدیلی لانے کی ایسی سیاست سے آخر کار کیا حاصل ہوگا۔

ان تین سوالات کے جوابات ہر اس شخص پر فرض ہیں جو تحریکِ اسلامی کے ذریعہ پاکستان

میں ایک اسلامی معاشرہ اور ریاست وجود میں لانا چاہتا ہے۔

اخلاقی اسباب کے بعد حکمتِ عملی اور تدابیر بھی کامیابی و ناکامی میں اہم کردار ادا کردیتے ہیں۔ جیسا ہم لکھ چکے ہیں کہ اگر فرنٹ اپنے بل پر ۱۰، ۱۵ سیٹ جیت لیتا' یا قاضی حسین احمد' ۸۸ اور ۹۰ کی طرح' ۷'۸ سیٹ کی بخشش پر راضی ہو کر' فرنٹ کو نواز شریف کے پہلو بہ پہلو لے جاکر کھڑا کردیتے' تو آج ہر خرابی نظرانداز کردی جاتی اور یہ تجزیئے اور کالم کہیں نظر نہ آتے۔ ہاں' ایک دوسرا طبقہ جماعت کے اندر' با دل گرفتہ اور چشمِ گریاں' ہمارا گریبان پکڑ رہا ہوتا۔ پھر ہم نے نواز شریف سے اتحاد کیوں نہ کیا۔ ہم اس سوال کا جواب تفصیل سے ستمبر ۱۹۹۳ کے شمارہ میں دے چکے ہیں۔ اس کو دہرانے کی ضرورت نہیں۔ ہاں' یہ سوال باقی رہ جاتا ہے کہ مفاہمت تو ہو سکتی تھی' اگر اتحاد نہ ہوتا؟ پھر کیوں نہ ہوئی؟ دوسرے یہ بھی کہا جارہا ہے کہ ہم نے نواز شریف کی ۱۵ تا ۱۹ سیٹیں چھین کر پیپلزپارٹی کے حوالے کردیں اور ملک پر ایک نسوانی اور مخالفِ اسلام حکومت مسلط کرادی۔

۱۔ جہاں تک پہلے سوال کا تعلق ہے' تو ایک واقعہ کے رونما ہونے کے بعد اس کے بیانات ہمیشہ مختلف ہو جاتے ہیں۔ ہم اس سلسلہ میں اپنی دانست میں صحیح صورتحال سامنے رکھ دیتے ہیں۔

(۱) جماعت کی قیادت آخر وقت تک' اپنا اصولی موقف قربان کیے بغیر' جناب نواز شریف سے مفاہمت کے لیے ذہناً" تیار تھی' کہ یہی عملی سیاست کا تقاضا تھا۔

(۲) جناب نواز شریف نے خود بھی یہ واضح اعلان کیا تھا کہ پاکستان مسلم لیگ تنہا انتخاب لڑے گی۔ وہ کسی کی محتاج نہیں' خود ہی دو تہائی اکثریت حاصل کرلے گی۔ ہاں چند پارٹیوں کو' اگر وہ ساتھ آنا چاہیں' ایڈ جسٹ کرلیں گے۔

(۳) وزارتِ عظمیٰ سے ہٹنے کے بعد انہوں نے منصورہ آکر بات چیت کے لیے وقت لیا۔ لیکن "بدقسمتی" سے اسی دن انہیں "سن اسٹروک" ہوگیا۔ انہوں نے ایلچی بھیج دیے' خود معذرت کرلی مگر پشاور چلے گئے' سن اسٹروک کے باوجود۔ اس کے بعد انہوں نے کبھی مفاہمت کی ضرورت محسوس کرتے ہوئے' ملاقات کی زحمت نہ اٹھائی۔ مفاہمت کی تالی دونوں ہاتھوں ہی سے بج سکتی تھی۔

(۴) پھر جب بھیجا' ایلچی بھیجا۔ ایک ایلچی سے پوچھا کہ آخر آپ کے پاس فارمولا کیا ہے؟

تو کہنے لگے، سات سیٹ لے لیجیے کہ یہ آپ کی تھیں۔ باقی کچھ چاہیے تو بات کریجیے۔ دوسرے جو بالکل آخر میں آئے، انہوں نے صاف کہا کہ ان کے پاس کوئی فارمولا نہیں۔ ان حالات میں، (i) جب کہ ہمیشہ کا تجربہ یہ تھا کہ ان کے امیدوار معاہدہ کے باوجود بھی بیٹھتے نہیں، بدنما جھگڑے چلتے رہتے ہیں، اور ہمیشہ یک طرفہ قربانی کا معاہدہ ہوتا ہے، اور (ii) مفاہمت میں کچھ چھوڑنے اور دینے کی گنجائش ان کے پاس نہ تھی، تو مفاہمت کس طرح ہوتی۔

(۵) مومن کو ایک سوراخ سے دو بار تو نہیں ڈسا جانا چاہیے۔ وہ قول و قرار کے لحاظ سے ناقابلِ اعتبار ثابت ہوئے ہیں۔ ۱۹۹۰ میں ہم نے ان سے صرف اتنا کہا تھا کہ ہمارے پارلیمنٹری لیڈر کو پبلک اکاؤنٹس کمیٹی کا چیئرمین بنا دیں۔ انہوں نے وعدہ کرلیا۔ لیکن یہ وعدہ بھی، دستور میں قرآن و سنت کی بالادستی درج کرنے کے وعدہ کی طرح، کبھی وفا نہ ہوا۔ چلیے، دستور کے لیے تو وہ کہتے ہیں ان کے پاس دو تہائی تعداد نہ تھی، (اگرچہ اس کے باوجود وہ آٹھویں ترمیم کے پیچھے استقامت کے ساتھ پڑے رہے، یہاں تک کہ اسی کے پیچھے اپنی وزارتِ عظمٰی سے بھی ہاتھ دھو بیٹھے)، پبلک اکاؤنٹس کمیٹی کے چیئرمین کے لیے تو دو تہائی اکثریت درکار نہ تھی۔ جب یہ وعدہ پورا نہ ہوا، تو اب سیٹوں کے بارہ میں ان کے وعدوں پر کیسے اعتماد کیا جاتا؟ معاہدہ کے بعد وہ کہہ دیتے کہ مسلم لیگی نہیں مانتے اور بیٹھنے کو تیار نہیں۔

(۶) جماعتِ اسلامی کو شریک رکھنے کے بارہ میں ان کی روش دیکھیے۔ پنجاب میں ہم نے کابینہ میں ایک وزیر دے دیا۔ اس کو ایک چپراسی مقرر کرنے کا اختیار بھی نہ تھا۔ نہ وہ کسی مشورہ اور فیصلہ میں شریک کیا جاتا۔ اس تجربہ کی روشنی میں جب ہم نے مرکز میں وزارت میں شامل نہ ہونے کا فیصلہ کیا تو ہمارے دوستوں نے بہت واویلا مچایا۔ گویا بس ایک وزیر دینے کی دیر تھی کہ سارے کام ٹھیک ہو جاتے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ انہوں نے ایک دفعہ بھی سنجیدگی سے یہ نہ کہا کہ آپ آیئے، کابینہ میں شامل ہوں اور میری مدد کریں۔

(۷) مرکز میں ہم نے فیصلہ سازی میں شرکت کا حق مانگا کہ اہم قومی اور خارجی امور پر فیصلوں کے لیے ایک آٹھ رکنی کمیٹی بنا دیں۔ چھ آدمی اپنے رکھیں، دو ہمارے۔ فیصلے آپ کثرتِ رائے سے کریں، لیکن بحث و تمحیص کے بعد۔ اس کے لیے وہ بالکل تیار نہ ہوئے کہ وہ وحدۂ لاشریک اقتدار کے خواہاں تھے۔

(۸) وہ ہمیشہ یہ طعنے دیتے رہے کہ ۸ تو آپ کی سیٹیں ہیں، وہ بھی ہمارے رحم و کرم پر، حالانکہ ہم نے انہیں سمجھایا کہ ہماری سیٹیں تو درویش کی چادر ہیں، رہی تو رہی، نہ رہی تو نہ

رہی۔ آپ کی وزارتِ عظمیٰ پھر ہاتھ نہ آئے گی۔

۹۔ اس وقت خود انہوں نے سنجیدگی سے مفاہمت کی کوشش کیوں نہ کی، جب کہ ان کی تو وزارتِ عظمیٰ داؤ پر لگی ہوئی تھی، اور پیپلزپارٹی کو اقتدار سے باہر رکھنے کی اصلی ذمہ داری ان کی تھی۔ اگرچہ ایک بیان یہ بھی ہے کہ وہ سنجیدگی سے مفاہمت کے خواہاں تھے۔

ہم آپ کو اس کا جواب بتاتے ہیں۔ اس لیے کہ وہ بہت اونچا اڑ رہے تھے۔ وہ اس خیال میں مست تھے کہ جماعتِ اسلامی ساتھ آئے نہ آئے ان کو دو تہائی اکثریت مل جائے گی۔ آٹھ ممبران ہی درد سر تھے، مان کر نہ دیتے تھے، بڑھ گئے تو درد سر بڑھ جائے گا۔ ان کے حلقۂ یاراں نے بھی ان کے دل میں یہ بات بٹھا دی تھی کہ مفاہمت جماعتِ اسلامی کی اپنی ضرورت ہے۔ وہ خود سات سیٹ کی خاطر دم ہلاتی چلی آئے گی۔ آخر ۱۹۷۷ سے وہ ایسا ہی نہیں کرتی چلی آرہی ہے؟ کچھ نہ ملا تو بھی اس نے ریفرنڈم میں ووٹ دیا۔ نہ آئی تو اس کے اکابرین اور قلم کار ہمارے ساتھ ہیں۔ ان کا ووٹر ۱۹۷۷ سے ہماری جیب میں ڈالا جاچکا ہے۔ ان سب کے دباؤ سے آئے گی۔ قاضی حسین احمد پھر بھی نہ جھکے، تو ووٹر خود ون ٹو ون مقابلہ کردیں گے۔ جماعتِ اسلامی کے غبارہ سے ہوا نکل جائے گی۔ پھر قاضی حسین احمد کو استعفیٰ دینے پر مجبور کرکے نکال باہر کیا جائے گا۔ پھر ایک نئی جماعتِ اسلامی بنے گی، جو کبھی آپ کے لیے درد سر نہ بنے گی۔ اس کا فلسفہ یہ ہوگا کہ ہم تو پچاس سال میں بھی زمامِ کار نہیں سنبھال سکتے، اس لیے مسلم لیگ کا دامن تھامے رہو، اور جو ملتا ہے وہ لے لو۔ وہ اس بھرّے میں آگئے، اور اپنا سب کچھ کھو بیٹھے۔ پتہ نہیں وہ سابقینِ جماعتِ اسلامی جو کالم لکھ لکھ کر قاضی صاحب کو اپنے موقف پر استقامت سے قائم رہنے کا مشورہ دے رہے تھے، وہ پیپلزپارٹی کے ایجنٹ کا کام کررہے تھے۔ یا وہ سابقینِ پیپلزپارٹی جو ان کے اردگرد جمع ہو کر ان کو درج بالا پٹیاں پڑھا رہے تھے، وہ پیپلزپارٹی کے ایجنٹ کا کام کررہے تھے۔ اس کا فیصلہ شاید کبھی مورخ کردے، ورنہ علام الغیوب تو ضرور کردے گا۔

۲ - اب دوسرا بڑا اعتراض بھی لیجیے، کہ ہم نے ان کی ۱۵ تا ۱۹ سیٹیں چھین لیں، اور پیپلزپارٹی کو حکومت دلوا دی۔ اس سلسلہ میں بھی چند باتیں عرض ہیں۔

(۱) پیپلزپارٹی کو اقتدار سے باہر رکھنے کی ذمہ داری صرف جماعتِ اسلامی ہی کی تو نہ تھی، اگر اب یہ کوئی اہم دینی ذمہ داری رہ گئی تھی۔ پیپلزپارٹی کو اقتدار سے باہر رکھنے کی فکر اور ذمہ داری ان کی ہم سے کہیں زیادہ تھی کہ ان کا ذاتی مفاد اور ملک و ملت کا مفاد اس پر منحصر تھا۔ ہمارے سارے دوست جو پنجے جھاڑ کر ہمارے پیچھے پڑے ہیں وہ ان سے کیوں نہیں پوچھتے اور ان

کا احتساب کیوں نہیں کرتے کہ انہوں نے پیپلزپارٹی کو کیوں آنے دیا ؟ صدر اسحاق اور فوج سے کیوں بگاڑی ؟ آٹھویں ترمیم کے پیچھے کیوں پڑے ؟ اسمبلی کیوں برخواست کی ؟ نومبر' دسمبر ۹۲ میں لانگ مارچ کی ناکامی کے بعد پیپلزپارٹی کو پھر سے قوت کیوں بنوا دیا ؟ آصف زرداری کو کیوں رہا کیا؟ تنہا پرواز کرکے اس کے مقابلہ میں جیتنے کے بجائے ہارنے کے راستہ پر کیوں گامزن ہوئے ؟

(۲) کچھ ایسا لگتا ہے کہ سیٹیں ان کی جاگیر تھیں' جو ان سے چھین لی گئیں۔ حالانکہ انتخابات میں ہرپارٹی اپنا منشور پیش کرتی ہے' اپنے ووٹ لیتی ہے۔ برطانیہ میں کوئی لبرل پارٹی پر الزام نہیں لگاتا کہ تم نے ہماری سیٹیں خراب کردیں۔ ہمارا اور ان کا منشور بھی ایک جیسا نہ تھا کہ کہا جائے کہ ہم نے ان کے ووٹ لے لیے۔

(۳) ہمارے ساتھ مفاہمت کرنے کی صورت میں ان کو جو کچھ مل سکتا تھا وہ ویسے بھی مل گیا۔ اکابر کی حمایت مل گئی' قلم کار مل گئے' ووٹر مل گئے۔ اب یہ فرض کرلینے کا کیا جواز ہے کہ جماعتِ اسلامی کا ہر ووٹ لازماً ان کے حق میں پڑ جاتا اور جن بچے کھچے ووٹرز نے ہمیں ووٹ دیے' ہم میدان میں نہ ہوتے تو وہ لازماً انہیں ووٹ دیتے۔ ہمارے ہاں خاصی بڑی تعداد ایسی ہے جو ان کو اور ان کے نمائندوں کو کسی صورت میں ووٹ دینے کے لیے تیار نہیں۔

(۴) کیا ہم مفاہمت کرلیتے تو وہ یقیناً جیت جاتے ؟ واقعاتی شہادت اس کے خلاف ہے۔ ۱۹۸۸ میں تو قاضی صاحب ان کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر قریہ قریہ گھومے تھے۔ پھر بھی وہ بمشکل پنجاب میں وزارت بنا سکے تھے۔ وہ بھی اس لیے بن سکی' اور قائم رہ سکی کہ صدر اور کمانڈر انچیف ان کی پشت پر تھے۔ اب آج نتائج ۹۰ کی طرح کیوں ہوتے' ۸۸ کی طرح کیوں نہ ہوتے۔ جب کہ نگراں حکومتیں ان کی پشت پناہ نہ تھیں۔

(۵) نواز شریف صاحب کو ایوانِ اقتدار سے باہر نکالنے کا بھی ہمیں کوئی شوق نہ تھا۔ نہ اس میں ہماری تسکین کا کوئی سامان تھا۔ ہم نے تو آخری وقت تک بھاگ دوڑ کی کہ وہ کسی طرح پانچ سال پورے کرلیں۔ وہ خود ہی نکلنے کے لیے بے تاب تھے' اور ایک کے بعد دوسرا گڑھا اپنے لیے کھودتے رہے۔ اب یہ خیال ضرور آتا ہے کہ جس نے اپنی بے تدبیریوں سے اپنا اقتدار اس آسانی سے گنوا دیا' کیا وہ ملکی مفادات کی حفاظت کرسکتا تھا؟

(۶) اور اگر کوئی اس بہتان و افترا پر اتر آئے کہ جماعت کی قیادت پیپلزپارٹی کو برسراقتدار لانے کا منصوبہ رکھتی تھی' تو وہ اس بات کا جواب بھی دے کہ پھر ۸۸ اور ۹۰ میں وہ نواز شریف صاحب کے دوش بہ دوش کیوں کھڑی ہوئی۔

(۷) بنیادی سوال یہ ہے کہ کیا اب پیپلزپارٹی اور جناب نواز شریف میں کوئی جوہری فرق رہ گیا تھا؟ ہم کو تسلیم ہے کہ یہ اختلافی مسئلہ ہے' لیکن مضبوط دلائل کی بنیاد پر ہماری یہ رائے ہے' اور یہ دلائل ہم گزشتہ شماروں میں بیان کرچکے ہیں' کہ ایسا کوئی جوہری فرق نہیں رہ گیا تھا۔ یہ صحیح ہے کہ ہم یہ بات ووٹرز کے دلوں میں اتارنے میں کامیاب نہ ہوئے۔ اس سے ہماری بات غلط نہیں ہو جاتی۔ آخر بیس سال سے ۳۷ فیصد ووٹرز کے دل میں یہ بات بھی تو اتارنے میں کامیاب نہیں رہے کہ پیپلزپارٹی اسلام اور ملک کی دشمن ہے۔

درج بالا اعتراض میں کوئی وزن ہوسکتا ہے تو اسی وقت جب ہماری رائے کو غلط ثابت کردیا جائے' اور ہمارے دلائل کا جواب دلائل سے دیا جائے' ان کی پالیسیوں کے حوالے سے دیا جائے' خاندانی شرافت' نماز اور شیروانی کے حوالے سے نہ دیا جائے۔

(۸) آخری بات یہ ہے کہ مولانا مودودیؒ نے ۱۹۴۱ میں جماعتِ اسلامی اس لیے تو نہ بنائی تھی کہ عورت "بینظیر" کو ہٹا کر مرد "بینظیر" کو اقتدار دلانے کے لیے اپنے اصول اور اپنا مقام سب قربان کردے۔ جماعتِ اسلامی تو غلبۂ اسلام کے لیے بنی تھی۔ اس معاملہ میں جناب نواز شریف کی روش ہمارے سامنے ہے'

○ انہوں نے بار بار اپنے فنڈا مینٹلسٹ ہونے کا انکار کیا ہے۔

○ انہوں نے ایک ایسا شریعت بل پاس کیا جو بعض لوگوں کی رائے میں کفرِ بواح پر مشتمل ہے۔

○ انہوں نے تعلیم کا محکمہ ایک سیکولر وزیر کے سپرد کیا' تو میڈیا کا ایک اباحت پسند وزیر کے۔ تعلیم ہمارے نزدیک سب سے اہم شعبہ ہے۔ انہوں نے پیپلزپارٹی کی تعلیمی پالیسی سرورق بدل کے ویسی کی ویسی ہی نافذ کردی۔

○ ان کے دور میں میڈیا جیسی "اسلامی" ثقافت کو ترویج دیتا رہا ہے' وہ سب کے سامنے ہے۔

○ انہوں نے جب ۱۷ اپریل کو قوم کے سامنے اپنے کارنامے بیان کیے' تو ان میں اسلام کا نام بھی نہ تھا۔ یہ مقام تھا اسلام کا ان کی نظروں میں۔

○ اقتدار چھوڑتے ہوئے بھی انہوں نے صرف اسلامی فلاحی حکومت کا لفظ بولنا کافی سمجھا۔

○ اس کے بعد جس منشور پر انہوں نے انتخاب لڑا' اس میں سے قرآن و سنت کو خارج کرکے میثاقِ مدینہ اور خطبۂ حجتہ الوداع جیسے مبہم الفاظ ڈال دیے۔ یہ اسلام سے راہِ فرار تھی۔ حالانکہ ۹۰ میں تو وہ بہانگِ دہل نفاذِ شریعت کا اعلان کرتے رہتے تھے' کہ اس وقت حصولِ اقتدار کے لیے

وہی ضروری تھا۔

کیا جناب نواز شریف امریکہ کی سازش کے تحت نکالے گئے ؟ اور اس لیے نکالے گئے کہ پاکستان کا کشکولِ گدائی توڑ ڈالنے کی راہ پر گامزن تھے ؟ سبحان اللہ ! تو اس سلسلہ میں کچھ اعداد و شمار ہم اکتوبر کے شمارہ میں پیش کر چکے ہیں۔ قرضوں کا بار ان کے دور میں اور تیزی سے بڑھا۔ ملک کی معیشت تباہ ہوئی۔ ہر معاملہ میں انہوں نے امریکی فرمائشیں پوری کرنے کی امریکہ کو یقین دہانی کرائی۔ معاشی ترقی کے سلسلہ میں مزید گفتگو کسی آئندہ شمارہ میں کریں گے۔ اس لیے کہ ہماری نظر میں تو معاشی ترقی کے سارے مغربی ماڈل اور فلسفے ہی مسترد کر دیے جانے کے قابل ہیں۔

اگلے شمارہ میں ہم انشاءاللہ جماعت کی مستقبل کی سیاسی حکمتِ عملی کے بارہ میں کچھ گفتگو کریں گے، اور اس کی تنظیم و تربیت کے بارہ میں بھی۔ ہمیں امید ہے کہ ہمارے رفقا ہماری درج بالا اور آنے والی گزارشات پر ٹھنڈے دل سے غور و فکر کریں گے۔ اس لیے کہ یہ نازک اور اہم سوالات ہیں، اور انکو حل کیے بغیر تحریک درپیش تہذیبی و تاریخی چیلنج کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔